# تصوّف

از جناب پروفیسر سید عبدالماجد صاحب سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن
(اسلامک) پٹنہ۔ بہار)

سید صاحب کا یہ مضمون ان کے گرامی نامہ کی ان سطور کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

"ایک مضمون تصوف پر بھیج رہا ہوں۔ اگرچہ تصوف پر بہت مضامین لکھے جا چکے ہیں لیکن یہ مضمون موجودہ دور کے نفسیاتی تخیلات کو ملحوظ رکھ کر لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں لفظ تصوف کی تحقیق جو اس میں درج ہے وہ شاید کم ملے۔"

یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ اِس دورِ مادّیت میں، جنگ و جدل کی فضا میں، سیاسی کشمکش میں پھنسی ہوئی دنیا کو تصوّف کی طرف مخاطب کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہم صدیوں سے مادّیات اور طبیعات کی طرف اپنی ساری توجہ، ساری کوشش، اور پوری محویت کے ساتھ مائل ہیں۔ ہم نے دنیا کے ذرّے ذرّے سے اپنے عیش، اپنے آرام، اپنی ضرورت کے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اور بظاہر ہم اپنی سطحی کامیابیوں پر فخر بھی کرنے لگے اور سمجھنے لگے کہ کائنات کا ہر ذرہ ہمیں راحت اور آرام پہنچانے کو پیدا ہوا ہے۔ اکثر جہل کے بعد انسان کو جہلِ مرکب حاصل ہوتا ہے جس کو وہ علم سمجھنے لگتا ہے لیکن حقیقۃً علم کی انتہا جہل ہے۔ ارسطو نے کہا کہ اگر مجھ کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ اربابِ عقل و فہم یہ سمجھیں گے کہ میں ہمہ دانی کا دعویٰ کرتا ہوں تو یہی کہہ دیتا کہ میں کچھ نہیں جانتا اور جب ابو شکور بلخی نے کہا

تا بجائے رسید دانش من  کہ بدانم ہمی کہ نادانم

تو علمائے وقت نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ دعویٰ ہمہ دانی ہے کیونکہ کچھ نہ جاننے کا علم اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو سب کچھ جان لے۔ اس کو آپ یوں سمجھیں کہ پہلے چیزوں کے وجود کا علم حاصل

ہوتا ہے بعد اس کے اس کی حقیقت کا علم۔ یہ تو امرِ مسلّم ہے کہ دنیا کی کسی چیز کی حقیقت کا علم انسان کو پورا پورا حاصل نہیں ہوسکتا اس لئے اتنا سمجھنے کو کہ کسی چیز کی حقیقت معلوم نہ ہوسکی یہ جان لینا ضروری ہے کہ چیزیں کیا ہیں۔ ایک بچے نے نہایت مسرور ہوکر مجھ سے کہا کہ میں نے تو آج سب کچھ پڑھ لیا اور وہ اس روز حروف تہجی تک پڑھ چکا تھا اس نے سمجھا کہ الف سے "یے" تک پڑھ لینا ہی سب کچھ پڑھ لینا ہے کیونکہ اُسے یہ نہ معلوم تھا کہ پڑھنا کیا چیز ہے اور پڑھنے والے کو کیا کیا پڑھنا ہوتا ہے۔ مجھ کو تو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے پڑھنے والے کچھ نہ پڑھ سکے۔ علم کے طالبوں کو کچھ نہ معلوم ہوسکا۔ اور علم الاوّلین و علم الآخرین حاصل ہوا تو ایک اُمّی کو۔ چار سو برس کی کوششوں کے بعد انسان ہوا پر اڑ سکا تو اس نے اس کو اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھا۔ میں تو جانتا ہوں کہ رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي کے چھوٹے سے فقرے نے کیا کیا کمالات دکھلائے۔ ہوا پر اڑنا یا چشم زدن میں بلقیس کا مسلّم تخت دور و دراز ملک سے اپنے سامنے منگا لینا معمولی کرشمہ تھا۔

ایک حقیقت شناس نظر کے سامنے انسان کی ساری کوششیں اور بلند پروازیاں ویسی ہی معلوم ہوتی ہیں جیسے لڑکوں کا کھیل۔ وہ کبھی کسی درخت کی شاخ کو زمین میں گاڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم درخت لگا رہے ہیں۔ کبھی دانوں کے بجائے پیسے مٹی میں گاڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیسے بو دیئے ہیں یہ پھلیں گے۔ ازیں قبیل اپنے بھولے پن میں ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس پر ایک سمجھ دار کو ہنسی آتی ہے۔ اسی طرح میں دیکھتا ہوں کہ انسان مادّیات میں محو ہے اور نتائج سے بے خبر۔

تصوف کیا ہے حقیقت کی طرف مائل ہونا۔ مجازات سے بے اعتنائی برتنا۔ اس کا کمالِ معرفت، توکل اور تفویض ہے۔ جب انسان اپنی کوششوں سے تھک جاتا ہے تب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانی طاقت سے بالا کوئی طاقت ہے اور اس کے بعد اپنی مجبوری اور اس بڑی طاقت کی ہمہ گیری کا علم ہوتا ہے اور بتدریج یہ علم یقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان تمام معاملات میں اس بڑی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے اسی بھروسہ کرنے کو توکل کہتے ہیں اور اپنے تمام مہمات اسی کو سونپتا ہے جسے تفویض کہتے ہیں۔

مسلمانوں میں تصوف کا وجود دوسری صدی ہجری کے قبل معلوم نہیں ہوتا ہے پروفیسر نکلسن اور پروفیسر براؤن نے مختلف اقوال درج کئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ تصوف ویدانت کے اصول پر مبنی ہے۔ کسی کے نزدیک مانیانی فلسفے پر اسلامی تصوف کا مدار ہے۔ بعضوں کے نزدیک بودھ مذہب اس کا مخرج ہے اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ نصرانیوں کی رہبانیت کی یہ دوسری شکل ہے۔ ان خیالات کی تاریخی حیثیت اور معقولیت پر تو میں آگے چل کر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا لیکن یہاں پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ویدانت کیا چیز ہے۔ اور اس کا تخیل کیونکر پیدا ہوا۔ آپ کو معلوم ہے شری کرشن جی نے اپنی نوجوانی کے دور میں نہایت ہی پر لطف محبت اور پریت کی زندگی بسر کی۔ اُس کے بعد جوان ہوئے تو مہابھارت کا معرکہ پیش آیا۔ اِس مہابھارت کے کشت وخون اور مہیب منظر نے اُن کے سامنے دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی کشمکش کی پریشانیوں کو نمایاں کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ کسی ایسی حقیقت کی طرف دعوت دیتے جو سراسر راحت، امن، اور سکون ہے۔ اس لئے انسان کی رہنمائی کے لئے گیتا اور اس کا فلسفہ پیش کیا۔ اسی طرح جب اردشیر مانی کا مخالف ہوا اور اُس کو ایران سے چین کی طرف بھاگنا پڑا تو وہاں جاکر ارژنگ چین مین اصلاحِ خیال اور اخلاق کی تصویریں پیش کیں اور گوتم بدھ نے جب اپنے دورانِ حکومت میں ظلم، تعدّی، خود غرضی، مردم کشی کے مناظر دیکھے تو اس سے تنگ آکر ساری چیزوں سے دستبرداری عمل میں لائی اور کسی ایسی حقیقت کی تلاش شروع کی جس سے انسان کو امن وسکون حاصل ہو۔ اور پھر اپنا فلسفہ نروان (Nirvana) اور اہنسا (Ahinsa) پیش کیا۔ نصرانیوں کے سامنے جب صلیب کا حادثۂ جاں فرسا واقع ہوا تو حضرت عیسیٰؑ کے متبعین نے رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تعلیم جاری کی۔ جنگ صفین کے قبل ہمارے مولا علیؓ نے جو بدر، احد، حنین اور غزوۂ خیبر میں اسد اللّٰہی کی شان دکھاتے رہے جب مسلمانوں کے ہاتھ سے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہتے اور کلام اللہ کو فریب اور تزویر کا آلۂ کار بنتے دیکھا تو تعلیم روحانی کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ واقعۂ کربلا کے ہوشربا منظر نے مسلمانوں کے دل، دنیا اور انتظامِ دنیا کی طرف سے پھیر لئے۔ یوں تو اُسی وقت سے جب یزید کی بیعت کی

دعوت شروع ہوئی، صحابۂ کرامؓ شہروں سے دیہاتوں اور پہاڑ کے دروں کی طرف جا کر گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ لیکن جب سلطنت عباسیہ کے دور میں بھی فاطمیوں کے لئے دنیا تنگ نظر آنے لگی تو مسلمان کثرت کے ساتھ ترکِ دنیا اور خلوت نشینی کی طرف راغب ہو گئے۔ خانقاہیں بن گئیں۔ ورد و وظائف کا دور چلنے لگا اور فتنۂ چنگیزی کے بعد تو سوائے حلقہ مراقبہ کے کوئی چارۂ کار ہی باقی نہ رہا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے سارے کاروبار سے دست بردار ہو کر تصوف کی راہ اختیار فرمائی۔

اب آپ بتائیں کہ آج جب سائنس کی ہلاکت آفرینی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مرغی کے انڈے کے برابر بنے ہوئے گولے سے نو میل کے دائرے کی تمام جاندار اور بے جان چیزیں فنا ہونے لگیں اور ہر ملک میں ایٹمک انرجی (Atomic Energy) کی تحقیق و تفتیش میں ادارے اور لائبریریاں قائم ہو گئیں تو میں آپ کو کیا صلاح دوں سوائے اس کے کہ ہم آپ اسی ایک قادرِ مطلق کی طرف متوجہ ہو جائیں جو ایٹمک (Atomic) اور اس سے زیادہ قوی طاقتیں جو وجود میں آنے والی ہوں سب کا خالق ہے اور جس کی طاقت تمام طاقتوں سے بالا ہے۔ اس لئے میں آپ کے سامنے تصوف پیش کرتا ہوں۔

علامہ ابن خلدون نے تصوف پر مدلل بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ لفظ تصوف کا مادہ صوف ہے جس کے معنی اون ہیں اس لئے تصوف کے معنی اونی لباس پہننا ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جو لوگ خدا کی یاد اور اس کی ولایت میں محو رہتے تھے وہ عموماً کمبل اوڑھا کرتے تھے اور دنیاوی معاملات سے کنارہ کش رہتے تھے۔ فارسی میں لفظ پشمینہ پوش ٹھیک اسی معنی میں مستعمل ہے۔ پروفیسر نکلسن نے جرمن کے اویب نالڈک کے ساتھ اتفاق کیا ہے جن کو علامہ ابن خلدون کی رائے سے اتفاق ہے اور پروفیسر نکلسن پروفیسر میکڈونیلڈ (Macdonald) کو بھی اپنی رائے کے اسناد میں پیش کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پروفیسر میکڈونیلڈ نے علوم مشرقیہ کی تحقیق و تفتیش میں بہت کاوشیں کی ہیں۔ لیکن انھوں نے اس لفظ کے مادے کے متعلق کوئی بحث

نہیں کی ہے سوائے اس کے کہ انھوں نے تواریخی پہلو اختیار کیا ہے۔ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ یونانی لفظ "سوفی" جس کے معنی خیال یا اصلاح خیال ہے اس کو تصوف سے کوئی مناسبت نہیں کیونکہ عربی میں وہ "س" سے لکھا جاتا ہے جس سے لفظ فلسفی یا فیلوسفی بنایا گیا ہے اور "صوفی" ص سے لکھتے ہیں۔ اور نہ لفظ تصوف کو "صفا" سے کوئی تعلق ہے اور نہ "صُفّہ" سے اگرچہ خود صوفی اپنے کو اہلِ صفہ سمجھتے ہیں یا "تبع اہل الصُفہ" تصور کرتے ہیں کیونکہ اربابِ صُفّہ میں وہ لوگ تھے جو اسلام کے ابتدائی دور میں جد وجہد۔ غزوہ و جہاد سے الگ تھلگ محض خدا ہی کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ اور جن کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم غنیمت کے وقت مجاہدوں میں شمار کر کے حصہ دیتے تھے کیونکہ وہ ہر وقت جہاد بالنفس میں مشغول رہا کرتے تھے۔ مسعودی نے اپنی کتاب "مروج الذہب" میں حضرت سلمان فارسیؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی خصوصیات میں سے پشمینہ پوشی اور خرقہ پوشی کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اُس دور کے اکثر بزرگ اور خود حضرت رسالت مآبؐ اور حضرت عمرؓ بھی کمبل اوڑھا کرتے تھے۔ اس کی سند میں خود کلام اللہ شاہد ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو "مزمل" اور "مدثر" کہا گیا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ان بزرگوں کو کبھی صوفی نہیں کہا گیا جس سے ہم یہ سمجھیں کہ کمبل پوش یا خرقہ پوش ہونا صوفی ہونے کی دلیل ہے۔ بہرحال لفظ تصوف کا مادہ "ص و ف" ضرور ہے اور جب یہ لفظ صوف اسم جامد ہوتا ہے تو اس کے معنی "اون" ہوتا ہے۔ لیکن تفعل "فعل" کا وزن ہے اور عموماً اس کا مادہ فعل ہوتا ہے اس لئے میری تحقیق یہ ہے کہ تصوف کا مادہ صَوف ہے جس کے مصدری معنی "تیر کا ایک طرف جھک کر چلنا" یا کسی چیز کو "عیب یا شر سے پاک کرنا" ہیں۔ اس لحاظ سے تصوف کے معنی "ایک طرف جھک جانا" یا "نفس کو عیب و شر سے پاک کرنا" ہیں۔ (لسان العرب) اب لفظ تصوف سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ حقیقت و مجاز کے درمیان رہ کر حقیقت کی طرف میلان پیدا کرنا ہے۔ مسلمان کسی وقت بھی دنیا ترک نہیں کر سکتا کیونکہ ہمارے ہادیٔ برحق نے لا رہبانیہ فی الدین فرمایا ہے یعنی دینِ اسلام میں ترکِ دنیا جائز نہیں ہے۔

اس سلسلے میں میں یہ عرض کر دوں کہ دین اسلام کیا ہے۔ ہمیشہ اس کے متعلق عوام الناس میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ کسی نے یہ سمجھا کہ خدا کی وحدانیت اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا یقین کرنا ہی مسلمان بن جانا ہے۔ اور ایک جماعت نے اس پر اتنا اضافہ کیا کہ عبادت یعنی نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج بھی لازم ہے۔ جس نے خدا کی وحدانیت کو مان لیا۔ رسولوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لایا۔ اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور عباداتِ اربعہ ادا کرتا رہا وہ مومن اور مسلم سب کچھ ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک نظامِ زندگی کا نام ہے۔ جس میں اپنے حقوق، خدا کے حقوق، یگانوں کے، ہمسایوں کے، شہر والوں کے، ملک والوں کے، عام انسانوں کے، حیوانوں کے، اور اللہ کی تمام مخلوقات کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں جس کی صراحت قرآن پاک اور حدیث نبویؐ میں موجود ہے اور جس کا قانون شریعتِ حقہ ہے۔ کیونکہ یہی تو رہبانیت ہے کہ انسان محض خدا کی عبادت میں مشغول رہے اور دوسروں سے علیحدگی اختیار کرے جس کی رسولِ خداؐ نے ممانعت فرمائی ہے۔"

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست به تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اس وقت اس کا موقع نہیں کہ میں عبادت اور حقوق و فرائض کی بحث چھیڑ دوں کیونکہ یہ بجائے خود ایک طویل بحث ہے۔ عرض کرنا صرف اتنا ہے کہ حقیقت و مجاز کے درمیان رہ کر۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ حقیقت کی طرف میلان پیدا کرنا ہی تصوّف ہے۔ اربابِ تصوف میں بہت کم ایسی ہستیاں ہیں۔ جنھوں نے تمام تعلقاتِ دنیاوی ترک کر دیے ہوں۔

اس دور کا تصوف کچھ اور ہی ہے۔ حقیقت سے ہٹ کر مجاز کی طرف میلان پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس کو یہ کہا جا سکے کہ وہ دین سے منحرف ہے۔ لیکن ہم میں کوئی ایسا بھی نہیں ہے جو دین کے مقابلے میں دنیا کی طرف زیادہ مائل نہ ہو۔ ہم نے جو معنی بیان کیے ہیں اس کے اعتبار سے تو وہ بھی صوفی ہیں جو دنیا کی طرف مائل ہیں لیکن اصطلاحاً تو صوفی انھیں کو کہا گیا ہے جو مجاز کے مقابلے میں حقیقت کی طرف زیادہ مائل ہوں بلکہ یہ میلان کمال تک پہنچے پہنچے

محویت تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حق حق کا نعرہ لگانے والے "انا الحق" کہنے لگتے ہیں۔

بعض مغربی فلاسفروں کی رائے ہے کہ اسلام کا تصوف افلاطونی فلسفۂ الٰہیات سے مستعار ہے۔ کیونکہ اصل الاصول اُس کا بھی وحدت الوجود ہے اور اِس کا بھی۔ کہا جاتا ہے کہ نوشیرواں کے زمانے میں جب یونان سے مستشرقین نکالے گئے اور اِن پر شہنشاہ جسٹینین کے مظالم ہونے لگے تو انھیں ایران میں پناہ ملی۔ اور ان کی کتابیں فارسی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ ہارون الرشید کے لڑکے مامون کے زمانے میں یونانی فلسفہ اسلامی درسگاہوں میں داخل ہوا جس کی وجہ سے افلاطونی فلسفۂ وحدت الوجود کے اثر سے انکار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ لیکن یہ خیال کہ فلسفۂ اسلام پر مانیانی تخیل کا اثر ہے ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پروفیسر براؤن بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ پہلوی ادبیات اور خاص کر مذہبی کتابوں کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے اس کا پتہ لگانا محال ہے۔ علاوہ بر ایں مانی کے متعلق الیعقوبی نے لکھا ہے کہ مانی حماد کا لڑکا تھا جس نے شاپور کو اپنے نئے مذہب کی طرف دعوت دی جس میں دو خدا کا تخیل تھا اور اُس کو اپنے قدیم مذہب زردشتی سے منحرف کرنا چاہا اور شاپور اس کی طرف مائل ہو گیا۔ الیعقوبی نے مانی کو زندیق بھی لکھا ہے۔ پروفیسر براؤن کی رائے ہے کہ لفظ زندیق لفظ صدیق سے منتقل ہو کر بن گیا ہے میرے خیال میں پروفیسر براؤن نے یہاں پر دھوکا کھایا ہے۔ لفظ "صدیق" کا منتقل ہو کر "زندیق" بننا بہت دشوار ہے۔ درحقیقت یہ لفظ "زندیک" کا معرب بنایا گیا ہے۔ "ژ" کے دو نقطے کم کر کے "ز" داخل کیا گیا اور "ک" کو محض معرب بنانے کے خیال سے "ق" کر دیا گیا اور "زندیک"۔ "زندی" کی تحقیر ہے اور "ژندی" نسبت ہے "ژند" و "پا زند" کی طرف جو مذہب زردشتی کی معتبر کتابیں ہیں۔ اور دو خدا کا تخیل بھی زردشتی تخیل ہے۔ ایزد اور اہرمن دو کا تخیل اسلام کی توحید کے متضاد ہے اس لئے یہ کہنا کہ اسلامی تصوف کو زندیقی فلسفے سے کوئی تعلق پیدا ہو سکتا ہے بعید از قیاس ہے۔

اس امر کے مان لینے میں کوئی دشواری نہیں کہ اسلامی فلسفے کا تعلق نصرانی عقیدے سے ہے لیکن نویں صدی عیسوی تک فلسفے کے اصول نصرانی گرجاؤں میں لامعلوم تھے۔ خود پروفیسر

براؤن کہتے ہیں کہ مغربی علاقے میں تصوف مسلم بن محمد ابوالقاسم مغربی اندلسی کے ذریعے ۱۰۴۲ء یا ۱۰۰۵ء میں پہنچا۔ اور ابن رشد نے اس کے بعد اس کو زیادہ روشن کیا۔ (ENCYCLOPADIA BRTANICA) میں درج ہے کہ ۱۰۹۶ء اور ۱۱۴۱ء کے درمیان سینٹ برنارڈ (St. Burnard) نے جو (Hugh of Victor) کا ہمعصر تھا فلسفۂ تصوف کو پھیلایا اور اغستانی خانقاہ جو پیرس کے نزدیک (St. Victor) میں قائم تھی بارہویں صدی عیسوی میں تصوف کا مرکز بن گئی جس نے مادیت کی طرف مائل ہونے والے پادریوں کو حقیقت اور روحانیت کی طرف مائل کر دیا۔ لوگ دین داری کی طرف مائل ہو گئے اور سادہ زندگی کے دلدادہ بنے۔ چنانچہ Neither Land میں (بقائن) (Beguine) (تبغرد) (Betgard) اور اطالیہ میں اور جنوبی فرانس میں Waldames فلسفۂ تصوف کے حامی پیدا ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمانوں کا اقتدار جنوبی فرانس تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اسپین علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پروفیسر براؤن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں ہی نے یورپ کو اس قیمتی دماغی سرمایہ سے بہرہ اندوز کیا۔ میں یہ کہہ چکا ہوں کہ St. Bernard ہی نے پہلے پہل یورپ کے گرجاؤں کو روحانیات سے آشنا کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک کتاب Private devotion یعنی تخلیہ کی عبادت لکھی۔ اس امر کے جاننے کے بعد کہ سینٹ ایڈورڈ برنارڈ ST. Edward Bernard الحمرا یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور عربی زبان اچھی طرح جانتے تھے یہاں تک کہ انگلستان کی کسی یونیورسٹی میں عربی زبان دانی کے پروفیسر بھی رہ چکے تھے کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ ان کے معلومات کا سرچشمہ اسلامی ہی درسگاہ تھا۔

پروفیسر گولڈزیہر (Golderzier) حضرت ابراہیم بن ادہم کے ترک سلطنت اور صحرانوردی کو گوتم بدھ کی تقلید بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی تسبیح بھی گوتم بدھ کے ماننے والوں کی نقل ہے لیکن یہ نہ بتا سکے کہ آخر گوتم بدھ کی تقلید کا ذریعہ کون سا وجود میں آیا۔ نکلسن (Nicholson) نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کو ان کے پیر ابوعلی سندھی

کے ذریعے سے بدھ کا فلسفہ نروان (Nirvan) اور خود فراموشی، بے خودی یا فنا فی الٰہی پہنچا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس کے متعلق کچھ اور دریافت کریں یہ دیکھنا ہے کہ گوتم بدھ نے خدا کے وجود کے متعلق کیا عقیدہ ظاہر کیا ہے۔ بدھ کی تعلیم نیستی میں فنا ہو جانا اسلام کے فنا فی اللہ ہو جانے یا افلاطونی فلسفۂ وحدت الوجود یا ویدانت کے ایک وحدت میں ضم ہو جانے کے بالکل خلاف ہے کیونکہ یہاں تو بجائے نیستی کے ہستی میں فنا ہو جانا ہے اور وہ بھی وہ ہستی جو نیستی سے قطعاً پاک ہے۔

ان بحثوں سے قبل یہ دیکھنا تھا کہ اسلام کی اصل تعلیم کے اندر یعنی کلام پاک اور حدیث نبویؐ میں تصوف کے اہم مسائل صراحتاً یا کنایتاً موجود ہیں کہ نہیں۔ مثلاً مسئلہ فنا فی اللہ کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہے یا نہیں۔ یہ حدیث قدسی ہے کہ جب میرا بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعے تقرب چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ یہی تو فنائیت کی آخری منزل ہے۔ اس طرح کی حدیثیں اور قرآن شریف کی آیتیں بہتیری موجود ہیں جن پر فلسفۂ تصوف کا دار و مدار ہے۔ آگے چل کر میں ان میں سے چند پیش کروں گا۔

جیمس ہیسٹنگ (James Hasting) نے Encyclopadia of Religian میں لکھا ہے کہ بدھ مذہب میں تصوف سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کے رو سے تصوف ایک واجب الوجود ہستی میں فنا ہو جانا ہے عام اس سے کہ وہ ہستی متشخص بالذات ہو یا نہ ہو۔ اسلام اور نصرانیت میں وہ ہستی متشخص بالذات ہوتی ہے اور افلاطونی فلسفۂ وحدت الوجود میں متشخص بالذات نہیں ہوتی۔ اور چونکہ گوتم بدھ کے نزدیک کسی ذاتِ واجب الوجود کا تخیل ہی نہیں موجود ہے تصوف کی نسبت بدھ مذہب کی طرف کرنا نرا اتہام ہے۔

یورپ کو اور یورپ کے اربابِ علم کو مسلمان اور اسلامی خیال و عقیدت سے سیاسی اور اقتصادی بنا پر عناد ہے اس لئے مسلمانوں کی ہر اچھی چیز اور اسلام کی ہر اچھی تعلیم کی نسبت دوسروں کی طرف کرنا چاہتے ہیں اس لئے اسلامی تصوف کی نسبت کبھی گوتم بدھ کی طرف کرتے ہیں کبھی گیتا کی طرف اور کبھی افلاطون کی طرف۔ حالانکہ خود قرآن مجید کی بیشمار آیتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ خدا یا وہ ذات واجب الوجود جو تمام کائنات کی خالق ہے انسان سے قریب ہے انسان کے رگ و پے میں ساری ہے۔ اور یہی اصل بنیاد ہے فلسفۂ تصوف کی۔

صوفی کے لئے لازم ہے کہ معرفت حاصل کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ، معرفت پہلے اپنی ذات سے شروع ہو کر اس واجب الوجود تک پہنچتی ہے جو تمام عالم کا خالق ہے۔ اور جو تمام تغیرات اور انقلابات سے پاک ہے۔ یہ مثل مشہور ہے کہ ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ہر انسان اپنے عمل سے اور ہر دوا اپنے خاصے سے۔ اسی طرح ہر علت اپنے معلول سے اور خالق اپنے مخلوق سے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر شے کی علت اور غرض دریافت کرے۔ اور یہی صفتِ انسانی انسان کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے یعنی یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھے اس کے متعلق، یہ دریافت کرے کہ یہ کیا ہے؟ کس لئے ہے؟ اور کیونکر وجود میں آئی۔ یہی جذبہ تمام تفتیش اور تحقیق، ایجاد و اختراع کا موجب ہے۔ قبل اس کے کہ ہم کسی اور چیز کی حقیقت، علت، یا غرض دریافت کریں، اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوں اس میں شک نہیں کہ ابتدا اس کی ایک تحیر اور استعجاب سے ہوگی لیکن انتہا معرفت اور ایقان تک پہنچے گی۔

اسی طریقے سے اربابِ معرفت نے اپنی منزلیں طے کیں ہیں۔

انسان سب سے زیادہ اپنی ذات کو جانتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اپنی حقیقت سے ناواقف ہے مگر اتنا ضرور جانتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے قائم کرنے اور قائم رکھنے میں کسی دوسری ہستی کا محتاج ہے۔ اس لئے اس کو بیک وقت اپنی مجبوری اور اپنے خالق کی قوت و کمال کا ادراک

ہوتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اس ذات سے وابستہ سمجھنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ دنیا کی ساری چیزوں سے مغایرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہر چیز کو اپنے لئے بے کار سمجھنے لگتا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ جو (نوافل) کے ذریعے مجھ سے تقرب چاہتا ہے میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے یا میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے یا میں اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ یہی درجۂ فنائیت ہے۔

ہم آپ دنیا میں طاقت چاہتے ہیں یا اختیار چاہتے ہیں، اعزاز چاہتے ہیں۔ اور رات دن انہی چیزوں کے حصول کی کوششوں میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن وہ طاقت و اختیار جو ہم دنیوی تدبیروں سے حاصل کرتے ہیں، اولاً وہ تدبیریں ناقابل اعتبار ہوتی ہیں، اور اس سے حاصل کئے ہوئے کمالات ناپائدار ہوتے ہیں۔ مجاز سے جو شے پیدا ہو سکتی ہے وہ مجاز ہی ہوتی ہے اور حقیقت سے حقیقت، اس ذاتِ حق کے اتصال سے جو قوت اور جو کمال حاصل ہوتا ہے اس میں بقا اور دوام ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا وجود روح اور مادہ کا مجموعہ ہے۔ مادے کا تعلق عالمِ ظاہر سے ہے۔ اور روح کا عالمِ باطن سے جسم سے جب روح الگ ہو جاتی ہے تو جسم فنا ہو جاتا ہے۔ اس جسم کو ذات سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ بخلاف اس کے جسم سے الگ ہونے کے بعد بھی روح فنا نہیں ہوتی۔ اور ہمارا عقیدہ ہے کہ روح، عالمِ ارواح میں اپنے خصوصیاتِ ذاتی کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ نیکوکار انسان کی روح علیین اور بدکار کی روح سجین میں۔ علیین میں اعمال کے اثر سے راحت اور سجین میں بدکاری اور معصیت کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔ جسم پیوندِ خاک ہو جاتا ہے۔ روح قیامت تک اور قیامت کے بعد بھی موجود رہے گی۔ کیونکہ مقام جنت ہو یا دوزخ اہلِ جنت کے لئے بھی خالدین فیہا کا حکم ہے۔ اور اہلِ دوزخ کے لئے بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح ابدی ہے۔ کیونکہ روح کو تو امرِ ربی فرمایا گیا ہے۔ اگرچہ جسم اور روح دونوں کا مبدا وہی ذات ہے لیکن روح کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اور جسم کی نہیں

کی. اس تقریر سے میرا منشا یہ ہے کہ انسان میں ایک ایسی طاقت موجود ہے جس کی نسبت اس ذات ابدی کی طرف ہو چکی ہے۔ اس لئے یہ کس قدر ہماری نادانی ہوگی کہ ہم عالم فانی میں محو ہو کر اپنی اس طاقت سے کام نہ لیں جس کو بقا و دوام ہے۔

مادہ پرست انسان بھی اب ہر چیز کے اصل اور جوہر کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر چیز کا جوہر اور اسکی روح ہی ہماری ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔ اس لئے میں نے آج ان کو یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ انسانی ترقیوں کا دارومدار بھی روحانی ہی ترقی ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی روحانی ترقی کے دور میں سیاسی اور مادی ترقیاں بھی کتنی سرعت اور استحکام کے ساتھ کیں۔ آج کی ترقی یافتہ قوموں سے کسی طرح روم اور ایران کی سلطنتیں اس دور میں کم ترقی یافتہ نہ تھیں۔ لیکن سارے ساز و سامان سرمایہ اور اسلحہ بادیہ نشین عربوں کے مقابلہ میں بے کار ثابت ہوئے۔ اب اس کا وقت نہیں کہ میں آپ کو ان مادی انتظامات کی طرف متوجہ کروں جن میں ہمارے حریف بہت دور نکل چکے ہیں۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ تصوف اور روحانیت کی طرف متوجہ ہو کر دیکھیں کہ آپ تھوڑی جدوجہد میں کتنی بڑی ترقی کر سکتے ہیں جس کا مقابلہ مادیات سے نہیں ہو سکتا ہے۔ تصوف حقیقت کی طرف مائل کرتا ہے مادیت مجاز کی طرف۔ یہ ہماری پستی ہے ہماری تنزلی ہے ہمارا زوال ہے کہ ہم حقیقت سے منحرف ہو کر مادہ اور مجاز کو اصل الاصول سمجھنے لگے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم اپنے حواسِ ظاہر سے حقیقتِ باطنی کا انکشاف نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمیں ان روحانی طاقتوں کو بڑھانا ہے جن سے باطن کا ادراک کر سکتے ہیں۔

میں اپنے اس چھوٹے سے مضمون میں آپ کے سامنے محض لفظ تصوف کے متعلق کچھ خیالات پیش کر سکا۔ لیکن اس کے صحیح علم۔ اس کے مباحث۔ اس کے اعمال اور اعمال کے نتائج اور ان کے فوائد بیان کرنا باقی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے موقع پر ان کو پیش کروں گا۔ لیکن میں تو اس کی اہلیت نہیں رکھتا کہ طریقۂ عروج منازل بتاؤں یا انکشافِ حقائق کرا سکوں ؎ این

سعادت بزور بازو نیست ۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ۔ (وھو العلیم الخبیر)

لیکن میں آپ کو کبھی وہ تصوف یا وہ عمل نہ بتاؤں گا جس کا نتیجہ ترک دنیا ہے اور جس کے حصول کے لئے

لب لباب ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ ہے اور جس کا مقصد دونوں عالم کی فلاح و بہبود ہی جس کے سامنے قیصر